عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات

(ایک جائزہ)

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

مدارس کے نظامِ تعلیم و تربیت میں نصاب کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نصاب تعلیم ہی دراصل تعلیم کے بنیادی مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے اور طلبہ کی تعلیمی زندگی کی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کی آبیاری میں یہ ایک موثر کردار ادا کرتا ہے دوسری جانب نصاب تعلیم، مدارس یا تعلیمی اداروں کی امتیازی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے تعلیمی رجحانات اور فکری میلانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے اگر مدارس کے نصاب کو مسلمانوں کی علمی دلچسپیوں اور تعلیمی ترجیحات کا BEROMETER کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ تعلیم جو ہر دور میں قوموں کی تمدنی و ثقافتی ترقی کے لیے بنیادی وسائل فراہم کرتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں اس کے مفید و موثر ہونے کا بہت کچھ انحصار نصاب پر ہوتا ہے موجودہ دور میں نصاب اور اس کے جائزہ کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ مذہبی و ثقافتی زندگی سے تعلیم کا رشتہ استوار ہونے کے ساتھ معاشی زندگی سے بھی اس کا بہت گہرا تعلق قائم ہوگیا ہے اس سے انکار نہیں کہ یہ تعلق کسی نہ کسی حد تک پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن اس دور میں یہ تعلق جس قدر گہرا اور مستحکم ہوگیا ہے ماضی میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم پر غور و خوض میں دلچسپی کافی بڑھ گئی ہے اور اس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت پر مباحثہ و مذاکرہ اور مختلف انداز

میں اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

جدید دور کے مدارس کے نصاب تعلیم یا کسی اور پہلو کا جائزہ لیتے وقت ہندوستانی تاریخ کے اُس دور پر نظر ڈالنا دلچسپی و اہمیت سے خالی نہ ہوگا جب یہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی اور نظام تعلیم کو اپنے طور پر چلانے کی انھیں پوری آزادی حاصل تھی، اُس دور کے تعلیمی نظام بالخصوص نصاب کا مطالعہ اس لیے ضروری و اہم ہے کہ موجودہ مدارس کے نصاب تعلیم میں ترمیم و اصلاح پر بحث کے ضمن میں اکثر یہ خیال پیش کیا جاتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مدارس کا نصاب تعلیم علوم نقلیہ و عقلیہ کا جامع تھا یا آج کل کی اصطلاح میں اس میں اسلامی و عصری دونوں قسم کے مضامین شامل تھے۔ اِس سیاق میں یہ مطالعہ بہت برمحل ہوگا کہ کیا اُس عہد میں واقعتہً باقاعدہ ایک نصاب تشکیل دیا گیا تھا اور درجات کی حدبندی و مدت تعلیم کی تعیین کے ساتھ طلبہ کو بہ یک وقت مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مروجہ نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ میری رائے میں اس کے لیے "نصاب تعلیم" کی اصطلاح استعمال کرنا درست نہ ہوگا اس لیے کہ اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ حکومت کی مقرر کردہ کوئی کمیٹی یا معاصر علماء کی کوئی مجلس تعلیم کے مختلف مراحل متعین کرکے ہر مرحلہ کے لیے کوئی نصاب تشکیل دیتی تھی اور پھر اسی نصاب کے تحت مدارس یا تدریس کے انفرادی مراکز میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مضامین کی تعیین اور ان کے مباحث کی تحدید نصاب کا لازمی عنصر ہے اور اسے روبہ عمل لانے کے لیے تعلیم کے مختلف مراحل کی واضح تقسیم، درجات کی حدبندی اور مدت تعلیم کی تعیین درکار ہوتی ہے اور یہ چیزیں عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مفقود نظر آتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس وقت مدارس کی کثرت کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے تحت درس و تدریس کا معروف طریقہ یہ تھا کہ مختلف علوم و فنون کے لیے انفرادی تدریسی مراکز قائم تھے جہاں اساتذۂ فنون اپنی دلچسپی کے خاص مضمون میں درس دیتے تھے اور طلبہ و شائقین علم اپنی دلچسپی و رجحان کے مطابق ان کے درس میں یکے بعد دیگرے شریک ہوتے تھے[1] مولانا آزاد بلگرامی (صاحب مآثر الکرام)

نے اسی طریقۂ تعلیم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند وہر جا موافقت دست دہد بہ تحصیل مشغول می شوند"[۱۱] اس طریقۂ تعلیم میں نہ تو درجات کی کوئی واضح تقسیم تھی اور نہ کسی خاص نظام الاوقات کے تحت مدت تعلیم کی تحدید یا مدرسہ اور اس کی عمارت کی قید وبند۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ درس و تدریس کے لیے کوئی باقاعدہ نصاب متعین نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ درس وتدریس کے لیے ہر مضمون سے متعلق کچھ کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ اس لیے اس عہد کے تعلیمی نظام سے متعلق بحث کے ضمن میں "نصاب تعلیم" کے بجائے درسیات کی اصطلاح استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اُس زمانہ کی درسیات کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مدارس یا انفرادی مراکز میں کون کون سے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاصر مآخذ میں مدارس کی تعمیر و مرمت، ان کے تعمیراتی محاسن، انتظام و انصرام کے لیے حکومت کے عطیات اور طلبہ و اساتذہ کے لیے وظائف سے متعلق کافی معلومات دستیاب ہیں۔ لیکن درس و تدریس کے مختلف مراحل اور نصاب تعلیم یا درسیات کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے اور یہ مواد بھی علماء و فضلاء اور صوفیاء و شعراء کے تذکروں میں منتشر یا غیر مرتب انداز میں پھیلا ہوا ہے۔ اس بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے سے جو تصویر ابھرتی ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب و علم معانی منطق و فلسفہ، علم کلام و تصوف، ہیئت و ریاضی اور کیمیا و طب جیسے مضامین کے پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ تفصیلات کی کمی کی وجہ سے قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زمانہ کے تمام مدارس اور انفرادی مراکز میں اِن مضامین کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ عہد سلطنت کے بعض مدارس بالخصوص "مدرسہ فیروز شاہی" کے بارے میں ہی یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، نحو و صرف، معانی و بیان، علم نظر، علم ریاضی، علم طبیعی، علم الٰہیات، علم طب و خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی[۱۲] اُس عہد کی کتابوں میں اہلِ علم وفن کی تعلیمی زندگی کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہر طالب علم بیک وقت ان تمام مضامین کو پڑھتا

اور ان میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ہی ایسے مضامین (مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، نحو و صرف، زبان و ادب وغیرہ) یا ان سے متعلق کتابیں ہیں جو اکثر علما و فضلا کی درسیات میں مشترک نظر آتی ہیں۔ باقی دیگر علوم کا سیکھنا اور ان میں مہارت کا حصول شائقین علم کی ذاتی دلچسپی اور انفرادی کوشش پر منحصر ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر عہد سلطنت کے ایک عالم مولانا قاسم دہلوی کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے ہدایہ، بزدوی، کشاف و مصابیح کا درس لیا[۳۷] یعنی فقہ، اصول فقہ، تفسیر و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے عالم (ابوحفص عمر بن اسحاق غزنوی) کے تذکرہ میں اتنا اور اضافہ ہے کہ انھوں نے عوارف المعارف کا بھی درس لیا۔[۳۸] مزید براں کسی کے بیان میں لغت و معانی کا ذکر ملتا ہے اور بعض کی تعلیمی زندگی میں عقلی علوم سے بھی دلچسپی نظر آتی ہے۔[۳۹] مختصر یہ کہ جن لوگوں کو مختلف علوم و فنون کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا وہ ان کے اساتذہ سے فرداً فرداً استفادہ کرتے تھے۔ ایسے شائقین کے لیے نہ تو مواقع اکتساب کی کمی تھی اور نہ ماہرین فنون کی رہنمائی کوئی مسئلہ تھا۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے اساتذہ سے بھی استفادہ کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اسے چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ معروف چشتی بزرگ اور فقیہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے مولانا عبدالکریم شروانی اور مولانا فخر الدین ہانسوی سے ہدایہ پڑھی۔ مولانا محی الدین کاشانی سے اصول فقہ کا درس لیا اور بعض دوسری کتابوں کے لیے شیخ شمس الدین محمد بن یحیی اودھی سے رجوع کیا۔[۴۰] اس طریقہ درس کی اس سے زیادہ وضاحت ان کے پیر و مرشد شیخ نظام الدین اولیاء کے تذکرہ میں ملتی ہے۔ انھوں نے مولانا علاء الدین اصولی سے فقہ و اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ شمس الملک سے مقامات حریری (عربی ادب) پڑھی، مولانا کمال الدین زاہد سے مشارق الانوار (حدیث) کا درس لیا۔ تفسیر کشاف کے لیے شیخ فرید الدین اودھی شافعی سے رجوع کیا اور عوارف المعارف (تصوف) کے درس کے لیے شیخ فرید الدین گنج شکر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔[۴۱] اسی طرح پندرہویں صدی عیسوی کے ایک گجراتی عالم راجح بن داؤد احمد آبادی کی تعلیمی زندگی کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے محمد بن محمود مقری حنفی سے صرف و

نحو اور منطق و عروض کی تعلیم حاصل کی، مخدوم بن برہان الدین سے علم معانی و بیان سیکھا، علم ہیئت و کلام کے میدان میں محمد بن تاج حنفی سے استفادہ کیا اور مکہ مکرمہ جا کر امام سخاوی سے حدیث کا درس لیا۔[۹] خود درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱/ ۱۷۴۷) کے بارے میں یہ تفصیلات دستیاب ہیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم سہالی میں اپنے والد ملا قطب الدین سے حاصل کی اور ان کی وفات کے بعد ان کا خاندان جب لکھنو منتقل ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس تھی اور وہ شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے۔ یہاں سے قصبہ دیوا جا کر انھوں نے مولانا عبدالسلام دیوی سے استفادہ کیا اور پھر جانس میں متعدد کتابیں ملا علی قلی سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق انھوں نے انتہائی کتابوں کے لیے مولانا امان اللہ بنارسی سے رجوع کیا۔[۱۰] اور صاحب سبحۃ المرجان کے بیان کے مطابق انھوں نے یہ کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے پڑھیں۔[۱۱] مزید براں بعض کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے ملا نقشبند گورکھپوری سے علم ہیئت کا رسالہ "قوشجیہ" پڑھا[۱۲] اور سلوک و تصوف کے میدان میں وہ شاہ عبدالرزاق بانسوی سے فیض یاب ہوئے۔[۱۳] یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ درس و تدریس کا یہ طریقہ کسی خاص مضمون تک محدود نہیں تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے باب میں یہی طریقہ اپنایا جاتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ و تصوف کے ساتھ عقلی علوم کے میدان میں بھی اختصاص پیدا کرنے کے لیے یہی طریقہ رائج تھا۔ علوم عقلیہ کے سلسلہ میں یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم سے متعلق درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ (۱۴۸۸ - ۱۵۱۸ء) سے خاص اس وقت شروع ہوا جب ماہرین معقولات شیخ عبداللہ تلنبی و شیخ عزیزاللہ تلنبی ملتان سے شمالی ہند منتقل ہوئے اور ان علوم کی ترویج میں مصروف ہوئے۔[۱۴] اس سے آگے یہ تاثر بھی دیا جاتا ہے کہ اس سے قبل اس کی درسیات بہت محدود تھیں، ہندوستان میں نہ تو ان علوم کے ماہرین موجود تھے اور نہ ہی اس میدان میں مہارت یا اختصاص حاصل کرنے کے مواقع دستیاب تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر عہد سکندر لودی سے قبل کے علماء کی تعلیمی زندگی اور ان کی علمی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس عہد میں بھی ان علوم و فنون کے ماہرین موجود تھے جو درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے

ہوئے تھے۔ دوسری جانب اس میدان میں دلچسپی لینے والوں کی بھی کمی نہ تھی جو ان میں حصولِ مہارت کے لیے اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ ذاتی مطالعہ و مشق کی راہیں بھی اپناتے تھے۔ لاہور میں غزنوی سلطنت کے زمانہ میں (۱۱ویں صدی عیسوی) ایک مشہور شاعر مسعود سعد سلمان گزرے ہیں جو عربی، فارسی و ہندوی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے عباسی دور کے ممتاز ہیئت داں البتانی کی مرتب کردہ زیج اور کتاب التفہیم کے حوالہ سے اپنے اشعار میں جس باریک بینی و وضاحت سے علم ہیئت کے مسائل بیان کیے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس علم پر ان کی گہری نظر تھی[۱۵] لاہور ہی ان کا مولد تھا اور وہیں ان کی نشوونما و تربیت ہوئی۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس شہر میں مسلم حکومت کے ابتدائی دور ہی میں علم ہیئت کی تعلیم کے مواقع فراہم تھے۔ اس کے بعد کے دور (تیرہویں تا پندرہویں صدی عیسوی) سے متعلق معاصر مورخین کے بیانات سے یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ معقولات کی مختلف شاخوں میں مہارت رکھنے والے علماء معتدبہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں منقولات کے ساتھ معقولات کے بھی ایسے ممتاز علماء موجود تھے جن کے ہمسر دوسرے مسلم ملکوں میں ملنے مشکل تھے[۱۶] اس عہد میں علم نجوم، ہیئت، منطق، فلسفہ و طب میں امتیاز پانے والوں میں شرف الدین، بدرالدین دمشقی، صدرالدین دہلوی، جوینی طبیب، ضیاء الدین نخشبی اور اعزالدین بدایونی شامل تھے[۱۷] اس سے قبل سلطان جلال الدین خلجی کے دور میں سعدالدین دہلوی منطق و حکمت میں مہارت کی وجہ سے منطقی کے لقب سے معروف ہوئے[۱۸] سلاطین دہلی میں خاص طور سے محمد بن تغلق کو عقلی علوم میں دلچسپی اور ان کی ترویج کے سلسلہ میں شہرت ملی[۱۹] اس کے معاصر علماء معقولات میں نجم انتشار، علیم الدین، عضدالدین اور معین الدین عمرانی قابل ذکر ہیں دونوں موخرالذکر اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ ان مضامین کی کتابوں کا درس دیتے تھے اور عضدالدین خود سلطان کے استادوں میں شامل تھے[۲۰] اسی دور میں علم طب کے میدان میں سرگرمی کا یہ عالم تھا کہ صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سیکڑوں ماہرین طب سلطان کے دربار سے منسلک تھے[۲۱] مزید براں سلطان فیروز شاہ تغلق کا زمانہ عام طور پر فقہی علوم کے غلبہ کے لیے مشہور ہے لیکن اس دور میں بھی عقلی علوم میں

دلچسپی اور ان سے متعلق تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس عہد کے بعض مدارس میں منطق، فلسفہ و علم کلام کے شامل ہونے کے واضح ثبوت بھی دستیاب ہیں۔ اس وقت جلال الدین رومی، جلال الدین کرمانی، عز الدین خالد خانی عبدالعزیز دہلوی وغیرہ متعدد علماء موجود تھے جو حکمت و فلسفہ اور علوم طبیعی میں خصوصی درک رکھتے تھے اول الذکر شارح شمسیہ شیخ قطب الدین رازی کے شاگردوں میں سے تھے اور درس و تدریس ان کا خاص مشغلہ تھا[۲۲]۔ موخرالذکر دونوں علماء نے علم ہئیت کی بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور یہ خود اس میدان میں ان کی دلچسپی کا غماز ہے[۲۳]۔ اس پر مزید اضافہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ فیروزشاہی میں علم طب میں دلچسپی و مہارت رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اس عہد میں متعدد شفاخانوں کا قیام بھی اس فن کی ترویج میں سلطان کی دلچسپی کا مظہر ہے[۲۴]۔ یہ شفاخانے نہ صرف علاج کی سہولتیں فراہم کرتے تھے بلکہ ان میں طب کی تعلیم و تربیت کے مواقع بھی مہیا تھے ان تمام تفصیلات سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ معقولات کا عام تعلیمی نصاب محض چند کتابوں (قطبی و شرح صحائف) تک محدود سمجھا جاتا ہے علمائے معقولات درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور جن لوگوں کو اس میدان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول مطلوب ہوتا تھا وہ ان سے رجوع کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی مطالعہ و تحقیق بھی جاری رکھتے تھے عہد وسطیٰ کی اس روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں "دانشمندی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی اس کے ساتھ بھی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون و صناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھتے تھے اور جن کے لیے صرف علمی مشق یا مطالعہ، مزاولت و ممارست کی حاجت تھی لوگ اس میں مشغول ہو جاتے تھے"[۲۵]۔ ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ علوم نقلیہ ہو یا عقلیہ ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اس فن کے استادوں سے استفادہ کا رواج تھا جو الگ الگ حلقۂ درس قائم کیے ہوئے تھے درحقیقت مروجہ مضامین میں ایک عام سطح کی تعلیم کے بعد اُن میں سے کسی یا کچھ میں مہارت کے حصول کے لیے ذاتی محنت و مشقت

زیادہ کام آتی تھی اس کے لیے نہ تو کوئی متعین نصاب یا منتخب کورس تھا اور نہ مدتِ اکتساب کی تحدید اور نہ ہی کسی مدرسہ یا ادارہ کی پابندی تھی۔ قدم و جدید طرزِ تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے قدیم نظامِ تعلیم کے اس مزاج و انداز کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے "قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود کا نام تھا وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا اس کے گرد مستفیدوں کی جماعت کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا۔ دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا اس کے حرکات و سکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش علمی لکچر تھے، استادوں کا سلسلہ، شاگردوں کا سلسلہ در سلسلہ پھیلتا جاتا تھا یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج یونیورسٹی یا جامعہ اعظم بن جاتا تھا آج کل لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے ..... آج کل کی یونیورسٹیاں یا کالج صرف بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے ذی روح کالج ہر قصبہ، ہر گاؤں اور ہر جھونپڑے میں قائم کیے جا سکتے تھے۔"[۲۵]

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی درسیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیم بہم پہونچانے میں علماء کے انفرادی تدریسی مراکز موثر کردار ادا کرتے تھے بلکہ درسی کتب کے انتخاب میں بھی یہی اساتذہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ اس زمانہ میں پڑھنے پڑھانے کے لیے مروجہ مضامین کے مباحث کی تعیین کے بجائے ان سے متعلق کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ درسیات کا یہ انتخاب دراصل علماء وقت یا اساتذۂ فنون کے ذاتی رجحانات اور ان کی صوابدید پر مبنی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے انتخاب یا درسیات کی تعیین میں زمانہ و مقام کے اختلاف سے فرق پایا جاتا تھا۔ مزید براں بعض اوقات علماء کے مختلف حلقوں میں ان کی اپنی دلچسپی یا فکری رجحان کے اعتبار سے ایک ہی فن یا مضمون کی الگ الگ کتابیں رائج ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہدِ سلطنت میں تفسیری درسیات میں زمخشری کی تفسیر کشاف کو (اپنے تمام تر قابلِ اعتراض پہلوؤں کے باوجود) سب سے زیادہ

مقبولیت حاصل تھی لیکن صوفی صفت یا صوفیوں کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے علماء میں تفسیر مدارک التنزیل (مصنفہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی) زیادہ مقبول تھی تاہم اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کشاف بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ ایک معروف صوفی شیخ حسام الدین مانکپوری (م ۱۴۴۹ء) قرآن کریم میں مسلسل غور و فکر کرتے رہتے تھے تفسیر مدارک ان کی محبوب تفسیر تھی جو ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی جب بھی انھیں کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو وہ اس سے رجوع کرتے[27] مشہور چشتی بزرگ خواجہ حسین ناگوری (م ۱۴۹۶ء) کے روزمرہ کے معمولات میں تفسیر مدارک کا درس شامل تھا۔[28] انہی کے شاگردوں میں قاضی احمد مجد نارنولوی (م ۱۵۲۱ء) تاحیات درس و تدریس میں مصروف رہے۔ وہ روزانہ عصر سے مغرب تک تفسیر مدارک کا درس دیتے تھے جبکہ صبح چاشت سے عصر تک دوسری کتابیں پڑھاتے تھے۔[29] انہی کے تذکرہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ "ایں وظیفۂ تفسیر مدارک سلوک مشائخ ایشاں است"[30] (تفسیر مدارک کا درس ان کے مشائخ کے معمولات میں شامل تھا) گرچہ معاصر تذکرہ نگار اور مورخین یہ وضاحت نہیں کرتے کہ صوفیوں کے حلقوں میں تفسیر مدارک کی مقبولیت کی کیا وجہ تھی لیکن بعض دیگر تفاسیر جو اس زمانہ میں صوفیوں کے حلقہ میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں ان کے بارے میں یہ واضح طور پر معلوم ہے کہ وہ صوفی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ اس زمرہ میں تفسیر 'عرائس البیان فی حقائق القرآن' (مصنفہ شیخ ابو محمد رزبہان بن ابی النصر) شامل تھی۔[31] ان مثالوں سے درسیات کے انتخاب میں انفرادی رجحانات و فکری میلانات کا عمل دخل اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ اس وقت کی درسیات پر معاصر علماء یا اساتذہ کے اثرات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعض جدید کتابوں میں عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں نصاب کی جس مرحلہ وار تبدیلی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے وہ دراصل بعض علماء کے ذاتی رجحان یا کسی خاص فن میں کچھ استادوں کی خصوصی دلچسپی کا مظہر تھی۔ مسلم عہدِ حکومت کے اولین دور میں مرکزی ایشیا کے علماء و فقہاء کے زیر اثر اور حکومت کی انتظامی ضروریات کی وجہ سے فقہی علوم کو کافی رواج ملا۔ سکندر لودی کے زمانہ میں بعض علمائے معقولات نے علوم عقلیہ کے میدان میں درس و تدریس پر خاص زور دیا اور اکبر کے دور میں کچھ ایرانی علماء و فضلاء کی وجہ سے عقلی علوم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بعد کے زمانہ میں علم حدیث میں دلچسپی رکھنے

والے علماء کے اثر سے اس علم کی اشاعت کا سلسلہ دراز ہوا اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بڑھا۔[۳۱]

عہد زیر بحث کی درسیات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر تمرینی وممارستی نوعیت کی تھیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے مقصود طلبہ کو مختلف مضامین یا فنون سے متعلق معلومات کا خزانہ بہم پہونچانا نہیں بلکہ اس خزانہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ اسی کے پیش نظر درس وتدریس کے لیے ایسی کتابیں منتخب کی جاتی تھیں جن سے انھیں ذہنی مشق حاصل ہو اور ان کی قوت مطالعہ تیز ہو ان میں اصلاً ایسی صلاحیت واستعداد پروان چڑھانا مطلوب تھا کہ اگر وہ مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد کسی مضمون میں مہارت حاصل کرنا یا اختصاص پیدا کرنا چاہیں تو انھیں اپنے مطالعہ وتحقیق کو آگے بڑھانے اور مذکورہ مقصد کی تکمیل میں کوئی دشواری نہ پیش آئے اسی وجہ سے علوم آلیہ (نحو وصرف، زبان وادب، بلاغت ومعانی، بیان وبدیع) کی تحصیل پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور مختلف مضامین کی مجمل ومغلق اور لغوی وفنی اعتبار سے پیچیدہ کتابیں پسند کی جاتی تھیں۔ تفسیر، فقہ، اصول فقہ وادب کے لیے بالترتیب کشاف، ہدایہ، بزدوی، مقامات حریری جیسی کتابیں اسی نوعیت کی تھیں۔ ان سے طلبہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور دوسروں کے مطالب گرفت کرنے کی لیاقت بخوبی پروان چڑھتی تھیں[۳۲]۔ مزید براں یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت کی درسیات میں منطق وفلسفہ کی کتابوں کی جو بھرمار تھی اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سے مذکورہ بالا مقصد (سوچنے وسمجھنے کی صلاحیت کی آبیاری) کے حصول میں کافی مدد ملتی تھی۔ منطق کا اس میں خاص معاون ہونا بالکل واضح ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کے تحت جس انداز سے فقہی مسائل کے استنباط کا طریقہ سکھایا جاتا ہے اور دلائل وبراہین کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس علم میں بھی قوت فہم کو تیز کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

درسیات کی تمرینی نوعیت پر ایک اور ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض درسی کتب (بالخصوص مشکل وپیچیدہ) کو بار بار ختم کرنے کی روایت بھی پائی جاتی تھی جیسا کہ متعدد معاصر علماء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کچھ کے بارے میں یہاں تک صراحت ملتی ہے کہ انھوں نے بعض کتابوں کو چالیس

چالیس مرتبہ ختم کیا۔ مثال کے طور پر عہد اکبری کے ایک عالم شیخ حاتم کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے بلاغت و معانی کی درسیات "شرح مفتاح العلوم اور مطول کو اول تا آخر چالیس مرتبہ ختم کیا۔[۳۴] اسی طرح مفتی جمال الدین دہلوی کی بابت یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے "عضدی" (علم کلام کی ایک کتاب) کا چالیس مرتبہ درس لیا۔[۳۵] یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُس عہد میں درسی کتابوں کو زبانی یاد کرنے کی روایتیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ وضاحت دستیاب نہیں کہ اس سے مقصود قوتِ حفظ مضبوط کرنا یا کچھ اور تھا، شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے تعلیم کے دوران "مقامات حریری" کے چالیس اسباق زبانی یاد کر لیے تھے۔[۳۶] مسالک الابصار کے بیان کے مطابق محمد بن تغلق اور صاحب اخبار الاخیار و سیر الاولیاء کے بقول اس سلطان کے بعض ہم عصر علماء (مثلاً مولانا حسام الدین ملتانی) کو ہدایہ ازبر تھی۔[۳۷] شیخ مبارک ناگوری سے علم قراءت کی مشہور کتاب "شاطبیہ" کا حفظ منسوب کیا جاتا ہے۔[۳۸] بابا داؤد مشکوٰتی کشمیری مشکوٰۃ کے حافظ ہونے کی وجہ سے اس لقب سے معروف ہوئے۔[۳۹] عبدالملک عباسی کو صحیح بخاری اور محمد معظم کو تفسیر بیضاوی زبانی یاد تھی۔[۴۰] شیخ احمد فیاض اَمیٹھوی اور ملا جیون امیٹھوی کو اکثر کتب متداولہ حفظ کرنے کا امتیاز حاصل تھا۔[۴۱]

آخر میں عہد اسلامی کے ہندوستان کی درسیات سے متعلق ایک اور نکتہ کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی درسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان میں بیرونی علماء ہی کی کتابیں شامل تھیں اور یہ کہ درس نظامی جاری ہونے کے بعد ہی ہندوستانی علماء کی کتابیں مروجہ درسیات کا حصہ بن سکیں۔[۴۲] یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ درس نظامی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے ہندوستانی مصنفین کی بعض کتابیں درسیات میں شامل ہو چکی تھیں۔ مثال کے طور پر حدیث کی درسیات میں مشارق الانوار[۴۳] (مولفہ حسن بن محمد صغانی لاہوری م ۱۲۵۲ء) نحو میں الارشاد[۴۴] (قاضی شہاب الدین دولت آبادی م ۱۴۴۵ء) صرف میں رسالہ عثمانیہ[۴۵] (مولانا فخر الدین زرادی م ۱۳۴۷ء) اور حکمت میں شمس بازغہ[۴۶] (ملا محمود جونپوری م ۱۶۵۲ء) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں ہندوستانی علماء نے مختلف علوم و فنون کی بنیادی کتب یا کلاسیکل متون پر متعدد

شروح وحواشی تیار کیے تھے اور یہ بھی بہت پہلے سے درسیات کا حصہ بن چکے تھے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں جو کچھ نصابی خاکہ پایا جاتا تھا اس پر کتابی رنگ غالب تھا۔ درسیات کا انتخاب اس طور پر کیا جاتا تھا کہ ان کی تکمیل سے مضامین کو گرفت کرنے کی صلاحیت اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں سمجھنے کی قوت پروان چڑھے۔ ان درسیات یا منتخب کتابوں کو اجتہادی یا تقلیدی نصاب کے پیمانہ میں ناپنا صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ افہام وتفہیم کے لیے چاہے ہم ان کے لیے "نصاب" کا لفظ استعمال کریں لیکن صحیح معنوں میں اس طرح کی کوئی چیز واضح شکل میں اس وقت موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے "نصاب تعلیم" میں مختلف مراحل میں جن تبدیلیوں کے رونما ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کچھ کتابوں کے تغیر وتبدل یا بعض مضامین کی درسیات میں کمی بیشی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ مزید براں معروضات بالا کی روشنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے نظام تعلیم کا آج کل کے مدارس اور ان کے نصاب تعلیم وطرز تدریس سے موازنہ کرنا درست نہ ہوگا۔ خاص کر دونوں عہد کے مزاج ونظام تعلیم میں بین فرق کو ملحوظ رکھے بغیر یہ رائے دینا مناسب نہ ہوگا کہ جس طرح اس زمانہ کے نصاب میں مختلف النوع مضامین شامل تھے اسی طرح آج کے مدارس کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ سماجی وسائنسی علوم کو شامل کر کے ان اداروں کے فارغین کو مختلف علوم وفنون میں جامعیت سے متصف کیا جا سکتا ہے درحقیقت دونوں عہد کے تعلیمی نظام کا موازنہ کرتے ہوئے عام طور پر یہ پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی خاص میعاد یا مدت مقرر نہیں تھی بلکہ علمی ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لیے مختلف علوم میں مہارت حاصل کرنا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ ایک میدان میں امتیاز پانے کے بعد دوسرے میدان میں تگ ودو شروع ہو جاتی تھی۔ آج کل کی طرح صورت حال یہ نہ تھی کہ طالب علم تعلیم کی ایک خاص منزل تک پہنچ کر یا کوئی مقرر کورس پورا کرنے کے بعد معاشرتی ضروریات یا عملی زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں تعلیم سے کسب معاش کا تعلق اتنا گہرا نہیں تھا جتنا آج ہے۔ ان سب کے علاوہ یہ بات بھی نظروں سے اوجھل

نہیں ہونی چاہئے کہ عہد وسطیٰ میں مختلف علوم وفنون (یا بالفاظ دیگر قدیم علوم وعصری علوم) کے درس وتدریس کے نظام میں وہ واضح فرق نہیں تھا جو اس وقت پایا جاتا ہے اس لیے ایک ہی نظام کے تحت مختلف علوم وفنون کی تعلیم کا اہتمام کرنا یا علوم نقلیہ و عقلیہ دونوں سلسلوں کو ایک ساتھ جاری رکھنا آسان تھا۔ موجودہ دور میں دینی علوم وعصری علوم کی تعلیم کے نظام اور درس وتدریس کے منہج میں اتنا بُعد پیدا ہوگیا ہے کہ دونوں میں امتزاج کی بات کرنا یا ایک ہی طالب علم سے دونوں میدانوں کو عبور کرنے کی توقع رکھنا نظری وفکری طور پر شاید صحیح سمجھا جائے لیکن عملی طور پر یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے الا آنکہ مدارس کا نظام تعلیم نیچے سے اوپر تک بالکل بدل دیا جائے اور جدید طرز پر اس کی پوری طرح اُوَرہالنگ کر دی جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میجر آپریشن میں مدارس کی بنیادی خصوصیات باقی رہ پائیں گی کہ نہیں۔ تجربہ ہی اس کا قطعی فیصلہ کر سکتا ہے۔

حواشی ومراجع

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم کا مقالہ "عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع" سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، ۱۲/۱ جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء. ص ۴۸-۵۴۔

۲؎ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۲۲۱-۲۲۲۔

۳؎ سیرت فیروز شاہی، نقل ۱۱۱ء (مخطوطہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ص ۱۲۷، ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۵۶۴۔

۴؎ میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۲۱۵، سید عبدالحیٔ نزہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۴۷ء، ۱۱۳/۲۔

۵؎ سیر الاولیاء، ص ۲۱۵، سید عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، ۹۵/۲-۹۶۔ محمد اسحاق بھٹی، فقہاء ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ۲۷۳/۱-۲۷۶۔

۶؎ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۹ء، ۲/۳-۳، ۶۷، ۷۷، رحمان علی خان تذکرہ علماء ہند، نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۶۲، نزہۃ الخواطر، ۳۸۴/۵

۷؎ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۳۸، فقہاء ہند، ۲۹۴/۱ - ۲۹۵

۸؎ نزہۃ الخواطر ۲/۱۲۲-۱۲۳، فقہاء ہند، ۱/۲۷۳-۲۷۴　۹؎ تذکرہ علماء ہند، ص ۶۲

۱۰؎ ولی اللہ، اعضان الاربعہ، مطبع کارنامہ، لکھنؤ، ۱۲۹۸ھ، ص ۵-۶، غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان (تحقیق وتدوین ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی) علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۳۹، مآثر الکرام ص ۲۲، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۴۱، نزہۃ الخواطر، ۶/۳۸۳۔　۱۱؎ سبحۃ المرجان، ص ۳۹

۱۲؎ مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ۳/۱۱۴

۱۳؎ اعضان الاربعہ، ص ۵، مقالات شبلی، ۳/۱۱۵

۱۴؎ بدایونی، ۱/۳۲۳-۳۲۴، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۱

۱۵؎ دیوان مسعود سعد سلمان (مرتبہ ناصر ہیری) چاپخانۂ قراین، ایران، خرداد، ۱۳۶۲ء، ص ۳۳۲-۳۳۳، شبیر احمد خاں غوری، اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج، معارف ۹۱/۵ مئی ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۹

۱۶؎ برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۲-۳۵۳۔

۱۷؎ برنی، ص ۳۶۲-۳۶۴، نزہۃ الخواطر، ۲/۱۴-۱۶، ۶۶، N.N. Law, Promotion of learning in India during Muslim Rule, Delhi 1973. P.39

۱۸؎ برنی، ص ۱۹۸، نزہۃ الخواطر، ۲/۴۸-۴۹

۱۹؎ برنی، ص ۲۶۴، نیز دیکھئے خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۲۷-۳۲۸

۲۰؎ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، ۱۳۳۲ھ، ص ۱۴۴، تذکرہ علماء ہند ص ۲۲۸-۲۲۹، فقہاء ہند، ۱/۳۰۴-۳۰۵، مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۴ء، ۱/۱۵۱-۱۵۲۔

۲۱؎ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ: آٹو اسپیس) علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۳۲۔

۲۲؎ نزہۃ الخواطر، ۲/۲۲۔

۲۳؎ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳، نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، کلکتہ، ۱۹۲۷ء، ۱/۲۳۴، نزہۃ الخواطر، ۲/۱۵، ۶۸۔

۲۴؎ فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۵-۱۶، طبقات اکبری، ۱/۲۴۱

۲۵؎ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ۱/۱۷۳

۲۶؎ مقالات شبلی، ۳/۱۰۲-۱۰۳

۲۷ـ اخبار الاخیار، ص۱۷۷، نزہۃ الخواطر، ۳/ ۵۵۔

۲۸ـ اخبار الاخیار، ص۱۸۵- ۱۸۶

۲۹ـ اخبار الاخیار، ص۱۸۶، تذکرہ علماء ہند، ص۹

۳۰ـ اخبار الاخیار، ص۱۸۶

۳۱ـ محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، القاہرہ، ۱۹۶۲ء، ۳/ ۵۶-۵۸

۳۲ـ سید عبد الحئ الحسنی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ۱۹۵۸ء، ص۱۱-۱۷، دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سیمینار) جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، ۱۹۹۰ء (مقالہ: دینی مدارس اور جدید طریقہ تدریس - از مولانا ابو العرفان ندوی) ص۸۰-۸۱

۳۳ـ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ۱/ ۲۹۸-۲۹۹، ۳۰۵

۳۴ـ بدایونی، ۳/ ۶۷، تذکرہ علماء ہند، ص۴۵

۳۵ـ بدایونی ۳/ ۷۷، تذکرہ علماء ہند، ص۴۳-۴۴

۳۶ـ اخبار الاخیار، ص۵۵، سیر الاولیا، ص۱۱۱

۳۷ـ مسالک الابصار، ص۳۷، سیر الاولیاء، ص۲۶۶، اخبار الاخیار، ص۸۹

۳۸ـ تذکرہ علماء ہند، ص۱۷۴

۳۹ـ تذکرہ علماء ہند، ص۶۰، نزہۃ الخواطر، ۵/ ۱۴۵-۱۴۶

۴۰ـ تذکرہ علماء ہند، ص۲۱۳، نزہۃ الخواطر، ۴/ ۱۸

۴۱ـ تذکرہ علماء ہند، ص۱۴، ۴۵

۴۲ـ مقالات شبلی، ۳/ ۹۹

۴۳ـ تذکرہ علماء ہند، ص۲۷۵، فقہاء ہند، ۱/ ۹۶-۹۷، ۱۲۶، ۲۰۴-۲۰۵، ۲۴۰، ۲۷۰، ۲۸۸، ۳۰۵۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص۱۱، G.D.M. Sufi, Al-Minhaj (The Evolution of Curriculum) Delhi, 1977, P.17

۴۴ـ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص۱۱، ۲۰، فقہاء ہند، ۱/ ۲۴۰، صوفی، محولہ بالا، ص۱۷

۴۵ـ اخبار الاخیار، ص۸۷، سیر الاولیاء، ص۱۱۱، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص۲۰

۴۶ـ تذکرہ علماء ہند، ص۲۲۱۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ ص۱۶، ص۲۶۵